باب اوّل

گرمیوں کی ایک رات کا جادو :-

پہلی بار جب بچے نے اپنے باپ کے حُجرے میں جھانک کر دیکھا تو اُس وقت وہ نو برس کی عُمر کا تھا ۔ اُس رات کا منظر سالہا سال تک اُس کے ذہن پر نقش رہا ۔

رات آدھی گزر چکی تھی مگر لُو رُکنے کا نام نہ لیتی تھی، لگتا تھا جیسے دُنیا کی دوسری جانب کسی ریگستان پہ سُورج چمک رہا ہے اور تپتی ہوئی ہوا وہاں سے سیدھی اِس گاؤں کا رُخ کر رہی ہے ۔ گھر کے وسیع صحن میں دو مچھر دانیاں لگی تھیں ۔ یہ موٹے موٹے روغنی پایوں والے نواڑی پلنگ تھے جِن پہ بچہ اور اُس کی ماں سفید جالی کے پردوں میں محفوظ سوئے پڑے تھے ۔ اِن سے ذرا ہٹ کر مزید تین چارپائیاں بچھی تھیں ۔ یہ موٹے بان کی تنگی چارپائیاں تھیں جن پہ گھر کا کام کاج کرنے والی لڑکیاں گرمی اور محنت سے بے دم ہوکر بیہوشی کی نیند سو رہی تھیں ۔ لڑکیوں کے ہاتھ پاؤں ، بازو اور ٹانگیں، گردنیں اور سینے ایسے زاویوں پہ مُڑے پڑے تھے کہ جیتے جاگتے بدنوں پہ ناممکن نظر آتے ۔ ان کی موٹی ململ کی تُھنّے دار شلواریں اِکٹھی ہو کر گھٹنوں تک اور باریک قمیصیں آدھے آدھے پیٹ تک اُوپر سرک آئی تھیں ۔ گو وہ گہری نیند میں تھیں مگر دن بھر کی تھکان اور تپش کے مارے مُستقل بے آرامی سے کروٹیں بدل رہی تھیں ۔

2009/08/23 13:53

اِن چارپائیوں کے علاوہ صحن کے کونے میں دُور جہاں نلکا لگا تھا ایک چارپائی الگ تھلگ پڑی تھی جِس کے اُوپر ایک کُبڑی سی سیاہ شبیہہ نظر آرہی تھی ۔ یہ مائی سروری تھی جو اپنی گدڑی کا خیمہ بنائے اُس کے اندر اکڑوں بیٹھی تھی ۔ اِس بلا کی گرمی میں بھی جب کپڑے کی صورت دیکھتے ہی جی گھبرانے لگتا تھا، مائی سروری گدڑی سر سے نہ اُتارتی تھی ۔ سردی ہو یا گرمی ، وہ گدڑی کے خیمے کے نیچے دِن رات رُو پوش بیٹھی رہتی تھی ۔ کھانے کے وقت سب نے پہلے اُس کا کھانا نکلتا اور لڑکی برتن لے جاکر گدڑی کے باہر چارپائی پہ رکھ کر واپس چلی آتی ۔ مائی سروری دو دو، تین تین روز کھانے کو مُنہ نہ لگاتی ، پھر ایک وقت ہاتھ گدڑی سے باہر نکال کر برتن اندر کھینچ لیتی اور کھا کر خالی برتن باہر دھکیل دیتی ۔ تاہم کھانے کا یہ دستور ایسے خدائی قانون کے مطابق گھر میں چلتا تھا کہ ایک پہر کا ناغہ بھی کسی کے تصور میں نہ آتا تھا ۔ وقت کے وقت کھانا اُس کی چارپائی پہ پہنچتا ، اور وقت نکل جانے پہ ویسے کا وَیسا اُٹھ جاتا ۔ یہ سب کے دیکھے کی بات تھی کہ گھر کی پالتو تین بِلّیاں اور دو کُتّے ، اور ٹکڑوں کی آڑ لگائے بیٹھے ہوئے کوّے اور چڑیاں جو ایسے نڈر ہو چکے تھے کہ منہ سے نوالہ چھیننے کو آتے تھے، مائی سروری کے تنگے کھانے کے قریب تک نہ پھٹکتے تھے ۔ گدڑی کے اُس بے حرکت ڈھیر کے گرد ایک ایسا اَن دیکھا حِصار کھینچا تھا کہ آدمی تو آدمی ، بے سمجھ جانور بھی اُس کے اندر پیر رکھنے کی جرأت نہ کرتا ۔ مائی سروری کو کبھی کسی نے لیٹے ہوئے نہ دیکھا تھا ۔ دن کے چوبیس گھنٹے اور سال کے بارہ مہینے وہ اُسی طور چارپائی پہ ٹانگیں اکٹھی کئے اور بازو اُن کے گرد باندھے ، گھٹنوں پہ کبھی ماتھا ، کبھی ٹھوڑی ٹِکائے بیٹھی کی بیٹھی رہتی تھی ۔ اُس وقت بھی جب تین چار لڑکیاں اُس کی چارپائی اُٹھا کر صُبح و شام ، موسم کے مطابق دھوپ سے چھاؤں اور چھاؤں سے دُھوپ میں مُنتقل کرتیں ، مائی سروری کی بیٹھک میں خلل نہ آتی ۔ ایک بار اسی طرح بیٹھے بیٹھے اُس کے چُوتڑوں میں زخم پڑ گئے ، مگر وہ بیٹھنے سے باز نہ آئی ۔ چنانچہ حکیم کے کہنے پر چارپائی کے اندر قینچی کاٹ کر دو سوراخ نکالے گئے ، اور بان کے کٹے ہوئے سروں کو سُوت سے باندھ کر گانٹھیں لگا دی گئی تھیں ۔ اِس سے چارپائی کے وسط میں دو گول گول آنکھیں نکل آئیں جن کے درمیان زخم آزاد ہوکر خُشک ہو گئے تھے ۔ یہ دو سوراخ بچے کے لئے بھی دو آنکھوں کا کام دینے لگے تھے ۔ ان آنکھوں سے وہ مائی کی تاریک

2009/08/23 13:53

دُنیا میں جھانکنے کے قابل ہو گیا ۔ گرمیوں کی لمبی سہ پہروں کو جب گھر والے سب کڑکتی دھوپ سے جان بچا کر اندھیرے کمروں میں پنکھے جھلتے جھلتے اُونگھ رہے ہوتے تو بچہ کمرے سے دبے پاؤں اُٹھ کر صحن میں نکل آتا ۔ صحن کے دوسرے کونے میں دھریک کی گھنی چھاؤں کے نیچے مائی سروری کی چارپائی پڑی ہوتی ۔ صحن دھوپ میں تپ رہا ہوتا ۔ بچہ جلتے ہوئے پاؤں پہ ٹاپتا ہوا جا کر چارپائی کے پاس کھڑا ہو جاتا ۔ تھوڑی دیر چھاؤں میں تلوے سہلانے کے بعد وہ زمین پر سیدھا لیٹ جاتا ۔ پھر وہ پیٹھ کے بل کھسکتا ہوا چارپائی کے نیچے داخل ہوتا اور ایسے مقام پہ جا پہنچتا جہاں چارپائی کے سوراخ اُس کے چہرے کے عین اُوپر واقع ہوتے ۔ وہاں پہ آرام سے لیٹا ہوا وہ دیر تک اُن سوراخوں کو دیکھا کرتا ۔ وہ سوراخ تو تھے نہیں کہ اُن کے پار کچھ نظر آتا ، بلکہ بان کے بیچ مائی کے کالے تہمد کے دوگول چٹاخ ہی دکھائی دیتے تھے ۔ مگر بچے کے لئے نہ وہ سوراخ تھے نہ کالے کپڑے کے چٹاخ، بلکہ دو روشن آنکھیں تھیں جن کے ذریعے وہ وہاں پہ لیٹا پڑا مائی کی ان دیکھی دُنیا کا تصور کرتا رہتا ۔ اس کے لئے وہ گدڑی کا تاریکی سے بھرا ہوا چھوٹا سا خیمہ نہ تھا بلکہ ایک وسیع و عریض دُنیا تھی جس میں دریا بہتے تھے اور پہاڑ تھے، پہاڑوں پہ درخت اُگے ہوئے تھے جن پہ چمکدار پھل لگے تھے اور نیچے ، درختوں اور دریاؤں کے درمیان، بڑی بڑی روشن سیاہ آنکھوں والے ہرن پھلانگتے پھرتے تھے اور کبھی خراماں ٹہلتے تھے ۔ بچہ اپنے تصور میں ان سب جگہوں اور پھلوں اور پھولوں اور جانوروں سے جان پہچان رکھتا تھا اور جہاں چاہتا آزادی اور حیرت کے عالم میں گھومتا پھرتا تھا ۔ حتیٰ کہ ایک روز اُس کا یہ خواب بھی تمام ہوا ۔

وہ دن مائی سروری کا ماہوار نہلائے جانے کا دن تھا ۔ مہینے کے اس ایک دن عموماً یُوں ہوتا کہ پہر آدھ پہر کے لئے گھر میں مرد ذات کا داخلہ بند کر جاتا تھا، یہاں تک کہ بچے کو بھی باہر کھیلنے کی ہدایت کر کے دروازہ بند کر دیا جاتا ۔ پھر دو لڑکیوں کی مدد سے مائی کی چارپائی اُٹھوا کر نلکے کے پاس لے جائی جاتی ۔ مائی کے کپڑے الگ کئے جاتے اور اُسے دیسی صابن سے مَل مَل کر نہلایا جاتا ۔ نہلانے کے بعد اُس کا بدن موٹے کھیس کی مدد سے خشک کیا جاتا، صاف چادر اور صاف کُرتا پہنایا جاتا ، بالوں میں تیل ڈال کر کنگھی ہوتی ، اور اس کے بعد

2009/08/23 13:54

مائی کو گدڑی اُڑھا کر اپنی جگہ پہ بٹھا دیا جاتا ۔ یوں مائی کا خیمہ مزید ایک ماہ کے لئے دوبارہ کھڑا ہوتا تھا اور بچے کی آنکھوں سے پوشیدہ ہی پوشیدہ یہ سب کام انجام پا جاتا ۔ اُس روز جب بچے کی یہ دُنیا مسمار ہوئی وہ بد قسمتی سے باہر کھیلنے کی بجائے، اپنے ساتھ والے گھر کی چھت سے ہوتا ہوا اپنے کوٹھے پر جا چڑھا ۔ کوٹھے کی دیوار کے جھرنوں سے آنکھ لگا کر جو نیچے صحن میں اُس نے جھانکا تو ایک ایسا منظر دکھائی دیا کہ بچہ گویا مسحور ہو کر دیکھتا ہی رہ گیا ۔ اُس نے دیکھا کہ ایک عورت ننگے بدن چارپائی کی پائنتیوں پہ سر نیہوڑائے بیٹھی ہے اور اماں اُسے صابن مل رہی ہے، جبکہ دو لڑکیاں پانی کا ڈول تھامے پاس کھڑی ہیں ۔ وہ بدن کیا تھا کہ ہڈیاں ہی ہڈیاں تھیں، جیسے ٹوٹی ہوئی لکڑی کی چھٹیاں ایک دوسری کے سہارے کھڑی ہوں ، جن کی نوکیں کھال کے اندر سے اِدھر اور اُدھر سے جھانک رہی تھیں، اور لگتا تھا کہ ہاتھ لگنے سے گر کر ڈھیر ہو جائیں گی ۔ اُن کے اُوپر اُوپر ڈھیلی سی کھال گیلی چادر کی مانند لٹک رہی تھی اور اماں کے صابن ملتے ہوئے ہاتھوں کے اندر چھاتیوں کی سُکڑی ہوئی خالی تھیلیاں تھلپ تھلپ کر رہی تھیں ۔ جھرنے سے آنکھ لگائے بچہ ایک ایسے سحر کے اندر مبتلا ہو گیا جیسے سُنا ہے کہ آدمی سانپ کی آنکھ سے آنکھ مل جانے پہ گرفتار ہو جاتا ہے کہ جس کے زیرِ اثر جائے رفتن نہ پائے ماندن کی کیفیت اُس پہ طاری ہو جاتی ہے ۔ وہ اُس وقت تک بے حرکت وہاں پہ بیٹھا رہا جبتک کہ گدڑی کا خیمہ چارپائی پہ دوبارہ استوار نہ ہو گیا ۔ مگر اس وقت تک بچے کی وہ اپنی الگ اور اکلوتی دُنیا اُس کے وجود سے کھسکنا شروع ہو چکی تھی ۔ وہ وہیں پر سیدھا زمین پہ لیٹ گیا اور آسمان پر نظر جما کر دیکھنے لگا ۔ وہ موسمِ بہار کا ایک ایسا دن تھا جب آسمان سفیدی مائل ہونے کی بجائے گہرے نیلے رنگ کا ہوتا ہے اور نیلاہٹ اُس میں ایک وسیع و عمیق گہرائی پیدا کر دیتی ہے ۔ اِس وُسعت کے زیر لیٹے لیٹے دیر تک آسمان کو دیکھتے رہنے پر بچے کو وہ نیلی سطح پہلے بُہت اُونچی اور پھر اپنے بُہت قریب سرکتی ہوئی محسُوس ہوئی ، اور اُس کو لگا کہ جیسے آسمان ایک ڈھکنے کی مانند زمین کے پیندے کو اپنے نیچے ڈھک کر رکھے ہوئے ہے ، اور اُوپر سے دباتا چلا آ رہا ہے ۔ اُسے اپنا وجود سُکڑتا ہوا محسُوس ہوا، حتّٰی کہ اُس نے اپنے ہاتھ اور پاؤں اور بدن کے دوسرے کنارے اپنے اصلی ماپ کو پہنچے ہوئے دیکھے ۔ قدو قامت کی وہ بڑائی جو اُس نے چارپائی کی [illegible] آنکھ [illegible] میں کر لی تھی، اب اُس کی زد

2009/08/23 13:56

سے باہر ہوتی جارہی تھی ۔ وہ دُنیا جہاں وہ کسی دیوہیکل کی طاقتوری اور ایک پرندے کی سی ہلکاہٹ سے سفر کیا کرتا تھا، اُس دُنیا کی بصیرت اُن آنکھوں سے ضائع ہوگئی تھی ۔ مائی سروری کے بارے میں سُنی سُنائی تھی کہ ایک زمانے میں وہ اِس علاقے کی حسین عورتوں میں سے تھی، جس کے گُن آج بھی پُرانے لوگوں کے درمیان گائے جاتے تھے ۔ پھر بد قسمتی سے نوجوانی میں ہی اُسے ایک زمیندار کے لڑکے سے عشق ہوگیا ، اور اُسی عشق کی سوگواری میں وہ رُل گئی تھی ۔ بچے نے بھی یہ اُڑتی اُڑتی سُن رکھی تھی، اور گو اس کے اصل معنی کی سمجھ بوجھ اِس عُمر میں اُس کو نہیں تھی، مگر اِس افواہ میں جِنّوں اور پریوں کی کہانیوں کا سا ایک رنگ تھا ۔ وہیں لیٹے لیٹے بچے نے اُس بات کو بھی یاد کرنے کی کوشش کی، مگر بیسُود ۔ وہ کہانی جس نے ایک عرصے تک بچے کے ذہن میں جادو جگائے رکھا تھا، اب اُس کے دِل میں ذرا سی حرکت پیدا کرنے سے قاصر رہی ۔ اُس روز وہ سورج غروب ہونے تک وہیں زمین پہ لیٹا آسمان کو دیکھتا رہا، حتّٰی کہ گھر میں اُس کی تلاش شروع ہوگئی ۔ کچھ دیر کے بعد جب باہر چیخ و پُکار مچی تو وہ اپنا دُکھتا ہوا بدن لے کر اُٹھا اور آہستہ آہستہ کوٹھے سے اُتر آیا ۔ اُس روز کے بعد بچہ کبھی نہ بھڑکتی ہوئی دوپہروں کو باہر نکلا نہ مائی سروری کی چارپائی تلے کھسک کر لیٹا ۔ بہار کا وہ شاندار دِن اُس کا جادُو چھین کر لے جا چُکا تھا ۔

نیند ہی نیند میں کہیں بچہ اُٹھ بیٹھا تھا ۔ جب اُس کی آنکھ کُھلی تو وہ بستر پہ چوکڑی جمائے بیٹھا تھا ۔ ہوش کے پہلے چند لمحوں میں اُسے کچھ خبر نہ ہوئی کہ وہ کہاں پہ تھا اور کیا کر رہا تھا ۔ آہستہ آہستہ جب اُس کے حواس برابر ہوئے تو اُس نے حیرانگی سے اِدھر اُدھر دیکھا ۔ اُس کی امّاں کا پلنگ معمول کے مطابق اُس کے پلنگ سے لگ کر بچھا تھا ۔ مگر اُس کی مچھر دانی کی جالی کا ایک کونا اُٹھا ہوا تھا ۔ یہ وہ سوراخ تھا جہاں سے اُس کی امّاں ہاتھ اندر داخل کرکے اُسے پنکھا جھلا کرتی تھیں ۔ عموماً وہ اُس وقت تک پنکھا جھلتی رہتیں جب تک کہ وہ سو نہ جاتا ۔ پھر وہ اپنا ہاتھ کھینچ کر مچھر دانی کا پلّو برابر کر دیا کرتیں ۔ مگر آج معلوم ہوتا تھا کہ نیند نے اُن پہ غلبہ حاصل کر لیا تھا ۔ اُن کا بازو دونوں پلنگوں کے درمیان تنگا پڑا تھا اور پنکھا ہاتھ سے سرک کر زمین پر گر چُکا تھا ۔ بچہ دیر تک بے خیالی سے اُس سوراخ کو دیکھتا رہا جسے اُس کی امّاں برابر کرنا بھول گئی

2009/08/23 14:02

تھیں ۔ اُس سوراخ سے دو تین مچھر اندر داخل ہو کر اُس کے کانوں میں بھنبھنا رہے تھے ۔ اِن مچھروں نے اُسے اُٹھا کر بٹھا دیا تھا ۔

بچے نے سر اُٹھا کر آسمان کو دیکھا ۔ آسمان کے ایک جانب آدھا چاند رُکا کھڑا تھا ۔ بچے نے یاد کیا کہ چند روز پہلے سونے کے وقت بستر میں لیٹے لیٹے اُس نے چاند کو دیکھا تھا ۔ اُس وقت چاند پُورا گول تھا اور سر کے عین اُوپر آسمان کے بیچ میں ٹنگ رہا تھا ۔ اُس رات کو چاندنی اِتنی سفید تھی کہ دِن کا سماں پیدا کرتی تھی اور آنکھیں بند کر لینے پر بھی روشنی پپوٹوں سے چھن چھن کر آتی رہتی تھی ۔ اُس رات کے بعد چاند نے ٹوٹنا شروع کر دیا تھا ۔ اب بچے کو چاند ایک ایسی روٹی کی مانند معلوم ہوتا تھا جس کے کنارے جھڑتے جا رہے ہوں ۔ اُس نے ایک سُست نظر صحن میں چاروں طرف دوڑائی ۔ چاندنی کوٹھے کی دیواروں سے گُزر کر مُشکل سے آدھے صحن تک پہنچ رہی تھی اور اس میں تاریکی آ چکی تھی ۔ پُورے چاند کی روشنی صاف سُتھری رات میں ایک اسرار کی کیفیت پیدا کرتی تھی ، جبکہ یہ تاریک چاندنی اپنے اندر ایک راز لئے ہوئے معلوم ہو رہی تھی ، گویا کسی غلاف میں چُھپی ہوئی ہو ۔ بچے کی نیند اُڑ چکی تھی ۔ اُس کے دل میں ایک عجیب سی خواہش پیدا ہوئی کہ وہ اِس چاندنی کے غِلاف کو پھاڑ کر ننگا کر دے ، تاکہ شفاف روشنی اپنا اسرار لئے دوبارہ سارے صحن میں پھیل جائے ۔ چاندنی کے اِس راز تک پہنچنے کی جُستجو نے بچے کے بدن میں حرکت پیدا کر دی ۔ وہ مچھر دانی میں ماں کے بازو والا سوراخ بند کرنے کی بجائے دوسری جانب سے پلو اُٹھا کر باہر نکل آیا ۔ اُس نے ہَولے سے پاؤں اپنی کھیڑی میں داخل کئے اور صحن کے بیچ کھڑا ہو گیا اب نیند اُس کی آنکھوں سے کوسوں دُور تھی ۔ اُس کی نظر لڑکیوں کی چارپائیوں کی جانب مُڑی اور وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا پہلی چارپائی کے پاس جا کھڑا ہوا ۔ تازی نیند میں بیہوش پڑی تھی ۔ بچے کی نظر تازی کے پیٹ پہ جا اٹکی ۔ سوتے میں اُس کا کُرتہ اُوپر تک سرک گیا تھا اور چاند کی آدھی روشنی میں اُس کا پیٹ سانس کے ساتھ ہَولے ہَولے تھرا رہا تھا ۔ درمیان میں ناف کے اندر ہلکی سی تاریکی کا سایہ تھا جس کے اندر جِلد کی ایک شِکن نظر آ رہی تھی ۔ بچے کا جی بے اختیار چاہنے لگا کہ وہ اپنی ننھی ناف میں داخل کر کے گول گول گھمائے ۔ اُس نے تازی کی ناف پہلے کبھی دیکھی

2009/08/23 14:02

تھی کو تازی نے اُسے کئی بار نلکے کے پیچھے مَل مَل کر نہلایا تھا اور نہلاتے وقت وہ کبھی اپنی اُنگلی اُس کی ناف میں ڈال کر کھجلی کیا کرتی تھی ۔ بچے نے ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ تازی نے نیند میں کروٹ بدل ڈالی اور ساتھ ہی ہاتھ سے اپنے پیٹ کو کھجلانے لگی ۔ جب وہ کھجلا چکی تو ہاتھ سر کے نیچے رکھ کر دوبارہ خواب میں چلی گئی ۔ مگر کھجلانے کی حرکت سے تازی کا کُرتہ کچھ اور اُوپر اُٹھ گیا جس سے اُس کی ایک چھاتی آدھی سے زاید عُریاں ہوگئی ۔ اُسے دیکھتے دیکھتے بچہ ایک سحر کی حالت میں ہَولے سے اپنے پاؤں پہ بیٹھ گیا ۔ اُس نے ہلکے سے اپنا ہاتھ چارپائی کی چوکاٹھ پہ رکھا ، اُس پہ اپنی ٹھوڑی ٹکائی ، اور چھاتی کی آنکھ سے آنکھ مِلا کر دیکھنے لگا ، حتّٰی کہ منظر کی گردش ایسی پھری کہ اندھیرا چاروں طرف سے اُمڈ اُمڈ کر اُس کی آنکھوں میں اُترنے لگا ۔ اُس نے سر اُٹھا کر آنکھیں جھپکیں ، اِدھر اُدھر دیکھا، سر کو آہستہ سے جھٹک کر منظر کو صاف کیا ، پھر از سرِ نَو آنکھیں چھاتی پہ جما دیں ۔ اُس نے چھاتیاں اماں کی پہلے دیکھی تھیں ، اور مائی سروری کی، اور دو ایک اور تگڑے بدن عورتوں کی اتّفاقیہ دیکھنے میں آگئی تھیں ۔ مگر ایسی چھوٹی سی کَس کر اُبھری ہوئی گول گندمی رنگ کی اور مہین سے اٹھے ہوئے نوکدار مُنہ والی چھاتی پہلے اُس کے دیکھنے میں نہ آئی تھی ۔ ایک ایک کرکے روئیں اُس کے بدن پر کھڑے ہونے لگے ۔ اِس گرم رات میں بھی اُس کی جِلد روئیں کی جڑوں پر تھی تھی بٹنیوں کی شکل میں ابھر آئی جیسی ٹھنڈک لگنے پر ہو جاتی ہے ۔ اُس کا دھیان ناف سے ہٹ کر اب چھاتی پہ مرکوز تھا اور اُس کا جی چاہ رہا تھا کہ ہاتھ بڑھا کر اپنی اُنگلی اُس گدرے گوشت میں چبھو دے ۔ اُسی وقت تازی کے جِسم میں پھر حرکت ہوئی اور وہ کروٹ سے ہٹ کر سیدھی پُشت پر دراز ہوگئی ۔ ساتھ ہی اُس نے نیند میں ایک پَل کو آنکھیں کھولیں اور ہاتھ سے کُرتہ ناف پر برابر کر دیا ۔ وہ منظر اب بچے کی آنکھوں سے اوجھل ہو چُکا تھا ، گویا کوئی راز پَل کے پَل کو منکشف ہو کر دوبارہ پردے میں چلا گیا ہو ۔ مگر وہ راز اُس بدن میں قوت کی ایک لہر چھوڑ گیا تھا ۔ جب وہ اُٹھ کر کھڑا ہوا تو جِسم کا بار اپنے پاؤں پہ محسوس تک نہ ہوا ، جیسے وہ ہوا کے ایک جھونکے میں تبدیل ہوگیا ہو ۔ اُس کی نظر اب تازی کی ٹانگ پہ جا رُکی تھی جِس پہ شلوار آدھی ران تک چڑھی ہوئی تھی ۔ ٹانگ پتلی اور گول تھی اور رنگ بھی ہاتھ پاؤں کی نِسبت ہلکا سا تھا جیسا کہ اُس کے پیٹ اور چھاتی کا رنگ تھا ۔ وہ لمبی ٹانگ تازہ اور تنے ہوئے

2009/08/23 14:03

گوشت میں گُندھی تھی ۔ اُسے دیکھتے دیکھتے بچے کے بدن میں بھی ایک عجیب تناؤ اُٹھا اور اُس نے بے خیالی سے اپنی اُنگلی آہستہ سے پاؤں کے اُٹھے ہوئے انگوٹھے پر رکھ دی ۔ تازی کو نیند میں اِس کا احساس تک نہ ہوا ۔ بچے نے محسوس کیا کہ گو اُس کی اُنگلی کا لمس انگوٹھے پہ بے معلوم تھا مگر کسی طور سے تازی کے جِسم کی حرارت تمامتر اُس کے انگوٹھے میں آجمع ہوئی تھی اور وہاں سے شرائے بھرتی اُس کی اُنگلی کے راستے اُس کے اپنے بدن میں بہتی چلی آرہی تھی ۔ جب تازی نے اپنی ٹانگ ذرا سی ہلائی تو بچے نے اپنا ہاتھ کھینچ لیا ۔ مگر اس دوران میں اُس کے بدن کو گویا پر لگ چکے تھے ۔ اُسے محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے وہ کِسی ہلکے پھُلکے پرندے کی شکل میں تبدیل ہو گیا ہے اور اُڑان کے لئے بیتاب ہے ۔ اُس کا ذہن پھیل کر ایک وسیع و عریض آسمان بن گیا تھا اور اُس کے دِل میں اُڑان کے سوا کسی بات کا دھیان نہ تھا ۔ اُس نے مڑ کر اپنے بستر پر نظر تک نہ ڈالی ۔ پنجوں کے بل ہلکے ہلکے قدموں چلتا ہوا وہ باہر کی جانب روانہ ہوا ۔ گھر کا کُتا جو اُسے بِستر سے اُترتے دیکھ کر کان اُٹھائے اُس کے پاس چلا آیا تھا، اور پھر جب وہ تازی کی چارپائی کے کنارے بیٹھ گیا تھا تو کُتا بھی اُس کے پاس زمین پر لیٹ گیا تھا ، اب اُٹھ کر بچے کے پیچھے ہو لیا ۔ جب بچے نے دروازہ کھول کر گھر کے باہر قدم رکھا تو اُس کی بوٹی بوٹی اُڑ رہی تھی =

دوسری دُنیا کا ایک منظر :۔

اپنی گلی اور ایک مُختصر سا میدان پار کر کے بچہ حُجرے کی جانب چل پڑا ۔ گو نام سے یہ حُجرہ کہلاتا تھا مگر حقیقت میں ایک لمبا چوڑا احاطہ تھا جِس کے اندر کئی چھوٹی بڑی کچّی اور پکّی عمارتیں کھڑی تھیں ۔ پکّی عمارتوں میں دو بڑے بڑے کمرے تھے جِن میں کھڑکیاں اور روشندان نکلے تھے ۔ ایک میں مسجد قائم تھی جہاں با جماعت نماز ادا کی جاتی تھی ۔ دوسرا کمرہ درویشوں کے اُٹھنے بیٹھنے، درس دینے، درس حاصل کرنے، وظیفہ اور حِفظ اور قرآن خوانی، اور سال کے سال قوالیاں مُنعقد کرنے میں کام آتا تھا ۔ کچّی عمارتوں میں ایک وسیع دالان تھا جو لنگر خانہ کہلاتا تھا ۔ اِس دالان میں مُختلف جِنسوں کی بوریوں کا ذخیرہ تھا ۔ ایک طرف پیاز اور لہسن گرمی سے بچاؤ کی خاطر فرش پہ پھیلے تھے، اور دالان میں اینٹوں کے دو بڑے بڑے چُولہے تھے جِن پہ سردیوں کے موسم میں دیگیں پکتی

2009/08/23 14:03

تھیں ۔ دالان کے ساتھ متعدد کچی کوٹھڑیوں کی قطار تھی جن میں اکثر کے اندر درویشوں کی رہائش تھی ، باقی غسل اور رفع حاجت کی جگہیں تھیں ۔ سارے احاطے کے گرداگرد نیچی سی پتھروں کی بنی ہوئی دیوار کھچی تھی جو اسے گاؤں سے الگ ایک چھوٹی سی بستی کی شکل عطا کرتی تھی ۔ یہ دوفٹ اُونچی دیوار ٹیڑھے میڑھے مختلف سائز کے پتھروں سے تعمیر شدہ تھی ، مگر پتھر اِس مہارت سے ایک دوسرے کے اُوپر جمائے گئے تھے گویا خاص طور پہ گھڑ کر شکل کے ساتھ شکل ملائی گئی ہو ۔ ساری دیوار کے اندر ایک سوراخ تک دکھائی نہ دیتا تھا اور اینٹ گارا لگی فصیل کی مانند مضبوطی سے کھڑی تھی ۔ دیوار کے بیچ ایک مقام پہ، جو احاطے کا ماتھا کہا جا سکتا تھا، دس بارہ فُٹ چوڑائی کا گیٹ کھڑا تھا ۔ یہ گیٹ تین نوعُمر درختوں کے پتلے پتلے تنوں کی مدد سے بنایا گیا تھا ، اسطرح کہ دو تنے سیدھے زمین میں گڑے تھے اور تیسرا اُوپر اُن کے سِروں پہ کیلوں سے آر پار ٹھونک دیا گیا تھا ۔ اِس اُوپر والے تنے کے ساتھ ٹین کا ایک چوڑا سا بورڈ لٹکا ہوا تھا ۔ بورڈ کی زمین سُرخ رنگ کی تھی اور اُوپر سبز حروف میں یہ عبارت لکھی تھی 'حُجرۂ پاک حضرت پیر کرامت علی شاہ بُراقی عُرف بابا چدر پوش بانی گدی شریف کچا کھوہ ، سلسلۂ کرامتیہ ، موضع کچا کھوہ، پنجاب' ۔ یہ شاہ صاحب بچے کے والد محترم تھے ۔ بچے کا نام سلامت علی تھا ۔

گیٹ کے رستے داخل ہونے کی بجائے بچہ دو فُٹ اُونچی دیوار پر لپک کر چڑھ گیا ۔ وہاں سے ٹاپ کر جب بچے نے احاطے کے اندر قدم دھرا تو سدھا ہوا کُتا وہیں پہ رُک گیا ۔ اُس مُقدس رقبے پہ کُتے کے ناپاک قدم کا داخلہ ممنوع تھا ۔ کچھ دیر تک کُتا بُھوکی بُھوکی مسکین نظروں سے بچے کے سائے کو عمارتوں کی جانب بڑھتے ہوئے دیکھتا رہا، پھر ٹانگیں سمیٹ کر قناعت سے پیٹ کے بل بیٹھ گیا اور تھوتھنی زمین پر رکھ کر ستانے لگا ۔

احاطے کے اندر کُھلی زمین پر کچی کوٹھڑیوں کے مقابل آٹھ دس چارپائیاں بچھی تھیں ۔ ان چارپائیوں پہ درویش اور اِمام ، کچھ ننگے ، کچھ چادریں اوڑھے سو رہے تھے ۔ صِرف ایک طرف کو دِیوار کے ساتھ لگ کر سائیں ناٹکا زمین پہ لمبا پڑا تھا ۔ بارہ مہینے سائیں ناٹکے کی کمر کے گِرد ایک مُختصر سی دھوتی بندھی رہتی اور اس کے سوا اُس کے بدن پہ کچھ نہ ہوتا تھا ۔ صِرف سردیوں کے مہینوں میں

وہ اپنے گرد ایک کھیس لپیٹ لیتا تھا ۔ مگر وہ کبھی کوٹھڑی یا کسی کمرے میں نہ جاتا تھا ۔ سردی ہو یا گرمی ، کھلے آسمان کے نیچے دن رات رہتا ، اور کھاٹ کے نزدیک تک نہ پھٹکتا بلکہ زمین پر بیٹھتا اور وہیں پہ سوتا تھا ۔ صرف ایک عادت اُس کی تھی کہ ہمیشہ احاطے کی پست سی دیوار کے ساتھ لگ کر بیٹھتا اور اُسی کے سائے میں سوتا تھا ۔ مذہب کے ظاہری اطوار سے اُس کو کوئی لگاوٹ نہ تھی ۔ نہ اُس نے کبھی درس میں حصہ لیا نہ ہی نماز کی نیت کی تھی، طہارت کے آداب سے کوئی واسطہ نہ رکھتا تھا ۔ نہانے دھونے کے پاس تک نہ پھٹکتا، جس کے نتیجے میں اُس کے سر اور ڈاڑھی کے بال گرد اور غلاظت کے باعث موٹی موٹی لٹوں کی صورت میں چپک کر لٹکے رہتے تھے ۔ ہر ایک کے ساتھ وہ نہایت دُرشتی اور بد زبانی سے پیش آتا تھا ۔ اُس کی آنکھیں مُستقِل سُرخ رہتیں اور چہرے پر غیض و غضب کے آثار رہتے تھے ۔ سب انسان و حیوان کو وہ گالیوں سے مخاطب کرتا تھا ۔ اگر کوئی پاس نہ ہو تو بے وجہ مُنہ اُٹھا کر گالیاں بکتا رہتا، یہاں تک کہ پیر کرامت علی شاہ صاحب، جو ذاتی طور پہ نہایت دِھیمی طبعیت والے اور نیک خصلت انسان اور روحانی طور پہ خُدا کی محبت میں گم تھے، جن سے کہ ایک زمانہ عقیدت رکھتا تھا، ان سے بھی بے ادبی اور بد لحاظی کا سلوک روا رکھتا تھا ۔ سائیں ننگا دُنیا بھر میں وہ واحد آدمی تھا جو پیر صاحب کے ساتھ تُو تڑاک سے پیش آتا تھا اور کئی بار اُن کی رُوبیشی میں واہی تباہی بکنا شروع کر دیتا تھا ۔ مگر پیر صاحب ہمیشہ اُس کے ساتھ نرمی برتتے تھے ۔ یُوں تو سائیں ننگے کی ہر بات لوگوں کی سمجھ سے بالاتر تھی ، مگر پیر صاحب کی موجودگی میں چند باتیں ایسی تھیں جنہیں وہ بار بار دہرانے لگ جاتا تھا ۔ مثلاً اُنہیں دیکھتے ہی وہ 'قیدی، قیدی ، قیدی' کی گردان کرنے لگتا، یا پھر اُونچی آواز میں 'مُردار کا ڈیرہ پیٹ میں ، مُردود کا ڈیرہ قید میں' پُکارنے لگتا ۔ اِس کے باوجود پیر صاحب کے وطیرے میں کبھی فرق نہ آیا تھا ۔ صرف کبھی کبھار سائیں کی پُکار سُن کر اُن کے چہرے پر ناگواری کے آثار پیدا ہو جاتے تھے ۔ اکثر اوقات وہ صرف مُسکرا کر گزر جاتے ، یا زیادہ سے زیادہ کسی پاس کھڑے ہوئے معتقد سے کہتے 'سائیں اللہ کا پیارا ہے، کچھ نہ کہو' ۔ یہ بات کسی سے چُھپی ہوئی نہ تھی کہ پیر صاحب کے دِل میں سائیں ننگے کیلئے خاص جگہ تھی ۔ سائیں کی کالیوں کی بہار اُس دیکھنے

2009/08/23 14:04

کی ہوتی جب چار چھ مہینے میں ایک ایک بار پیر صاحب کے حکم پر نائی، سائیں کے ناخن کاٹنے کے لئے آتا ۔ یُوں تو سائیں پر ہاتھ ڈالنے کی کسی میں ہمت نہ تھی، مگر جب پیر صاحب اپنی موجودگی میں نائی کو حکم دیتے تو سائیں اپنا ہاتھ نائی کے ہاتھ میں دے دیتا، گو اُس کی آنکھیں غصّے سے اُبلی پڑتیں اور زبان سے گالیوں کی بوچھاڑ جاری رہتی ۔ نائی اُس کے ہاتھ کو قابو میں رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہے جاتا، 'سائیں کیوں میرے اگلے پچھلوں کی مٹی خراب کرتا ہے ، بیچارے مر مرا گئے، تیرا کیا نقصان کر گئے ۔ میں تو تیری صفائی ہی کر رہا ہوں ، کیا بُرا کر رہا ہُوں' ۔ جیسے ہی نائی اُس کی آخری اُنگلی کا ناخن کاٹ چکتا سائیں اچانک ایک زور دار دوہتڑ نائی کی پیٹھ پر جماتا اور کود کر اُٹھ کھڑا ہوتا ۔ پھر وہ دیوار کے پاس جاکر زمین پر بیٹھ جاتا اور دُور سے پیر صاحب کی جانب رُخ کرکے 'قیدی ، قیدی، قیدی' اور 'مُردار کا ڈیرہ پیٹ میں' کی رٹ لگا دیتا ۔ کچھ دیر کے بعد وہ مُنہ پھیر کر ہوا میں گالیاں بکنے لگتا ۔

سائیں کے بارے میں البتہ ایک بات مشہور تھی ۔ جہاں وہ مرد، عورت، حیوان و نباتات تک کو بخشتا نہیں تھا، اُس نے آج تک کسی بچے کے ساتھ برہمی نہ دکھائی تھی ۔ کوئی بھی بچہ اُس کے رُو برو آجائے ، سائیں کی زبان میں گنگ پڑجاتا تھا ۔ یہ نہیں کہ اُس کے اندر نرمی یا محبت آجاتی، بلکہ معلوم ہوتا تھا کہ گویا اُس نے آسیب دیکھ لیا ہو ۔ آواز اُس کی زبان کو چھوڑ جاتی اور وہ گم سُم ہو جاتا اور اُس وقت تک اِس حالت میں رہتا جب تک کہ بچہ اُس کے سامنے سے ہٹ نہ جاتا ۔ اِسی وجہ سے گاؤں کے بچے سائیں سے ذرہ برابر خوف نہ کھاتے تھے ۔

سلامت علی درویشوں کی چارپائیوں کے برابر سے گُزرتا ہوا سائیں کے سر پہ جا کھڑا ہوا ۔ سائیں ایسے آرام سے سخت زمین پہ سویا پڑا تھا گویا بِستر پہ دراز ہو ۔ بچہ کچھ دیر تک وہیں کھڑا سائیں کو آسانی سے محوِ خواب لمبے سانس لیتے ہوئے دیکھتا رہا ۔ پھر اُس کے جی میں کیا آئی کہ پلٹ کر حُجرے کی جانب چل پڑا ۔ گو یہ سارا احاطہ اور اِس کی عمارتیں حُجرہ کہلاتی تھیں، مگر دراصل حجرہ اس سارے سلسلے میں ایک ہی تھا اور اسی کے وجود سے اِس چھوٹی سی جگہ کا نام چلتا تھا ۔ یہ حُجرہ وہ کمرہ تھا جو بچے کے والد بزرگوار پیر صاحب گدّی والے کی ذاتی

2009/08/23 14:04

استعمال میں تھا ۔ یہ کمرہ کی عمارتوں کے ساتھ آخر میں واقع تھا، اور باہر سے اِس کی امتیازی حیثیت اُس تکونے سبز جھنڈے سے واضع ہوتی تھی جو ایک بانس کے سرے پر بندھا حُجرے کی چھت کے اُوپر ہر وقت پھڑ پھڑایا کرتا تھا ۔ جھنڈے پر بڑے سُنہری حرُوف میں لکھا تھا، "گدی شریف کرامتی"، اور حاشیے پر چھوٹے سُنہری الفاظ میں بِسم اللہ الرّحمانِ الرّحیم اور کلمہ شریف درج تھا ۔ حُجرے کے دروازے پر ٹھکے ہوئے کیلوں سے مُختلف نوعیت کی اشیاء، جیسے تازہ اور باسی پھُولوں کے ہار، گانٹھیں لگے ہوئے سُوت کے دھاگے ، کُچھ تعویز اور تسبیحیں وغیرہ، لٹکی رہتی تھیں ۔ اندر حُجرہ دو کمروں میں بٹا تھا ۔ ایک باہر کی بیٹھک جہاں حاضری کے لئے آنے والے معتقدین یا غرضمند اپنی باری کے انتظار میں پھُولدار چادر بچھی زمین پر آکر بیٹھا کرتے ۔ دوسرا اندر والا کمرہ ، جہاں پیر صاحب کی اصل گدی کا تکیہ تھا ۔ اس کمرے میں قالینوں کا فرش پڑا تھا اور دیوار کے ساتھ ساتھ گدیاں اور تکیے رکھے تھے ۔ جِس جگہ پر پیر صاحب کی نشست تھی وہاں سب سے اعلیٰ درجے کا چھوٹا سا قالین بچھا تھا اور اوپر سبز مخمل کا گاؤ تکیہ دیوار کے ساتھ پڑا تھا ۔ دائیں طرف کو سبز مخمل کی ہی جائے نماز بچھی تھی جِس پہ پیر صاحب کبھی کبھار استغراق کی حالت میں جا بیٹھے تھے گو اُنہیں نماز ادا کرتے ہوئے کبھی کسی نے نہ دیکھا تھا ۔ جائے نماز کا ایک کونہ ہر وقت اُلٹا رہتا تھا تاکہ خالی وقت میں اُس کے اُوپر شیطان سے کِسی خباثت کے سرزد ہونے کا امکان نہ رہے ۔ مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ کی تصویریں ، اور ہاتھ سے لکھی ہوئی قرآنی آیات ، شیشے کے اندر فریم شدہ چوکھٹوں میں دیواروں پر چاروں طرف ٹنگی ہوئی تھیں ۔ دِن رات کے اکثر اوقات اگر بتیوں کا خوشبُودار مدّہم دُھواں حُجرے کے ماحول میں تحلیل ہوتا رہتا تھا ۔ بچے نے جب دروازے میں قدم رکھا تو باہر والی بیٹھک خالی تھی ۔ پیر صاحب کے حکم کے مطابق اُس احاطے کے اندر کوئی عمارت ایسی نہ تھی جِس کا دروازہ چوبیس گھنٹے کھُلا نہ رہتا ہو ۔ اس حکم سے استثناء صرف ایک دروازے کو تھا ، اور وہ دروازہ اصل حُجرے کا تھا ۔ یہ دروازہ صرف اُس وقت کھُلتا تھا جب پیر صاحب کا قیام حُجرے سے باہر کسی اور مقام پہ ہوتا ۔ جوں ہی وہ حُجرے میں وارد ہوتے ، دروازہ بند ہو جاتا اور اُس وقت تک بند رہتا جب تک وہ اندر قیام پذیر رہتے ، گویا دروازے کا بند ہونا ہی اندر پیر صاحب کی موجودگی کی دلیل تھا ۔ بچے نے بند دروازے کی درزوں میں سے لیمپ کی روشنی

2009/08/23 14:05

چمنتی ہوئی دیکھی اور کچھ دیر تک ہلکے ہلکے سانس لیتا ہوا خاموش کھڑا رہا ۔ پیر کرامت علی ، جنہیں خلقت خدا بابا پیرو مُرشد کے نام سے بھی یاد کرتی تھی، اپنی بیوی اور بچے کی زبان سے فقط شاہ جی کہلاتے تھے ۔ بچہ جو یوں بھی کبھی کبھار ہی حُجرے میں قدم رکھتا تھا، رات کے اِس پہر تو کبھی گھر سے نہ نِکلا تھا ۔ اسی ہچکچاہٹ میں وہ بند دروازے کے باہر ٹھہرا رہا کہ شائد شاہ جی سو رہے ہوں ۔ کرامت علی شاہ کے بارے میں ایک غیر معمولی بات یہ تھی کہ وہ کبھی اپنے گھر کے اندر نہیں سوتے تھے ۔ کبھی بُھولے بھٹکے آنکلتے تو بچے کی ماں کے کمرے میں بیٹھ کر اُس سے ایک آدھ گھڑی کوئی بات کر لیتے ، ورنہ ہمیشہ حُجرے میں رات بسر کرتے ، سوائے سال کے ایک دو موقعوں کے جب وہ دورے پر آس پاس کے گاؤں میں اپنے چند ایک بڑے بڑے مُریدوں کے ہاں قیام کی غرض سے نکلتے ۔ اِس دورے کا مقصد مُریدوں کو زیارت سے نوازنا تو تھا ہی ، اِس کے علاوہ نئے معتقدین کو وعظ و نصائح اور بیعت کا موقعہ فراہم کرنا بھی ہوتا تھا ۔ دورے کے اِختتام پہ پیسے کے علاوہ بُہت سا چڑھاوے کا مال بھی آتا جس کو لنگر خانے میں داخل کر دیا جاتا ۔

بچے نے آخر جُرأت کر کے دروازے کے پٹ پہ ہاتھ دھرا ۔ اندر سے کُنڈی نہ لگی تھی ۔ پٹ بے آواز طور پہ وا ہوگیا ۔ بتی اِتنی دھیمی تھی کہ اگلی کے ناخن کے برابر ہی لائٹ دے رہی تھی ۔ مگر بچے کی نظریں چند ہی لمحے کے وقفے میں اُس نیم روشن کمرے سے مانوس ہوگئیں ۔ اُس کے بعد اُس نے جو منظر دیکھا اُس نے بچے کو از سرِ نو گویا مسحُور کر لیا ۔ مگر یہ سحر ایک انوکھی طرز کا تھا ۔

شاہ جی اپنی گدی پہ تکئے سے ٹیک لگائے بیٹھے تھے ۔ اُن کے ایک ننگا بدن قالین پر لمبا چت پڑا تھا ۔ اِس بدن کے پاؤں دروازے کی اور سر دوسری جانب تھا ۔

نو عُمری کے اعتماد کی کو حد مقرر نہیں ہوتی، پھر بھی بچے نے از حیرت کے ساتھ آنکھیں کھول کھول کر اِس منظر کو دیکھا اور اسے پہچاننے کی کوشش کی ۔ اُسے نظر آیا کہ وہ الف ننگا بدن، جِس کے تلوں پہ جُوتا تک نہ تھا ، ایک عورت کا جِسم تھا جس پہ سر سے لے کر پاؤں تک شاہ جی اپنا ایک ہاتھ نہایت آہستگی

2009/08/23 14:05

سے بار بار پھیرے جا رہے تھے ۔ عورت کی آنکھیں بند تھیں اور وہ بے حرکت وہاں لیٹی تھی، گویا بیہوش پڑی ہو ۔ مگر شاہ جی کے ہاتھ میں خدا جانے کوئی تیل لگا تھا یا کیا تھا، کہ اُس جسم کے اعضاء چمکدار چکنی مٹی کے ایسے ڈلوں کی مانند دکھائی دے رہے تھے جو بل کا تیشہ لگ لگ کے کٹ چکے ہوں اور گول اور نوکدار اور ہموار شکلوں میں شاہ جی کے ہاتھ سے اُبل اُبل کر نکلے پڑتے تھے ۔ بچے کی منظر اب آسانی سے کمرے کے آرپار اُتر رہی تھی اور خواہ گوشت کے چھکے تھے خواہ بالوں کے گچھے، اُس کی آنکھ کی حد سے باہر نہ تھے ۔ شاہ جی نے اپنی سفید براق چادر اوڑھ رکھی تھی اور سر پہ سبز رنگ کے کپڑے کی کاڑھی ہوئی گول ٹوپی پہنے ہوئے تھے ۔ وہ اِس طرح بیٹھے تھے گویا روز مرہ کے اوقات میں مریدوں اور معتقدوں کی حاضری کے موقع پہ بیٹھے ہوں ۔ صرف اُن کے آگے بچھے ہوئے بے لباس جسم اور اُس کے اُوپر چلتے ہوئے موٹی موٹی نیلی نسوں اور اُبھری ہوئی ہڈیوں والے ہاتھ نے ایک انوکھی سی فضا پیدا کر رکھی تھی ۔ شاہ جی کے ہونٹ وا نہ تھے ، مگر وہ حلق کے اندر سے ناک کے رستے ایک لمبی تان والی گہری گنگناتی ہوئی آواز پیدا کرتے جا رہے تھے جیسے کسی لَے کا ورد کر رہے ہوں ۔ عجیب بات تھی کہ اِس لَے کو سُنتے اور اس منظر کو دیکھتے ہوئے بچے کے دل میں ذرہ بھر، ہیجانی کیفیت پیدا نہ ہوئی، بلکہ وہاں کھڑے کھڑے اُسے ایسا محسوس ہونے لگا گویا اُس کا دِل آہستہ آہستہ بیٹھتا جا رہا ہے ۔ دفعتاً اس کے دِل میں خیال پیدا ہوا کہ وہ جسم نہ سویا پڑا تھا نہ ہی بیہوش تھا، بلکہ مُردہ حالت میں تھا ۔ دیر تک تاک لگائے وہ اُس بند چہرے کو دیکھتا رہا جِس میں رتی برابر حرکت کے آثار نہ تھے، اور اُس آواز کو سُنتا رہا جو کسی دوسری دنیا سے آتی ہوئی سنائی دے رہی تھی ۔ رفتہ رفتہ اُس کے دِل میں یہ خیال یقین کی صورت اختیار کر گیا کہ فرش پہ پڑی ہوئی وہ ایک لاش تھی، اور شاہ جی اُسے زندہ کرنے کی کوشش کر رہے تھے ۔ اُسے گمان تھا کہ شائد کچھ دیر میں شاہ جی اُسے زندہ کر لیں، مگر کمرے میں دور تک زندگی ناپید تھی اور کمرے کی فضا پر موت کا سایہ تھا ۔ وہ بے آواز قدموں سے پلٹ کر کمرے سے نکل آیا ۔

• واپسی پر وہ احاطے کے گیٹ سے نکلا تو کُتا جو اُس کے انتظار میں وہیں بیٹھا تھا، اُٹھ کر ساتھ ہو لیا اور سر جُھکائے سُستی سے بچے کے پیچھے پیچھے چلنے

لگا ۔ گھر کے صحن میں قدم رکھ کر بچے نے کتے کو اندر داخل کیا اور دروازے کی کنڈی چڑھادی ۔ پھر اپنے پلنگ کے پاس پہنچ کر اُس نے مچھر دانی کا پلّو اٹھایا اور بستر پہ چڑھ کر لیٹ گیا ۔ صحن میں چاندنی کا رنگ سیاہی مائل ہوچکا تھا ۔ بچے نے نہ مچھردانی کی موری بند کی اور نہ ہی تازی کی چارپائی پہ نظر ڈالی ۔ اُس کی آنکھوں میں وہی دوسری دُنیا کا منظر گھوم رہا تھا جو ابھی سے گرمیوں کی رات کے ایک سوتے جاگتے خواب کی کیفیت لئے ہوئے تھا ۔ دیر تک اُسے نیند نہ آئی اور وہ بستر پہ سیدھا لیٹا مچھر دانی کی جالی کے اندر سے آسمان کو دیکھتا رہا ۔ آدھی رات کا جادُو جو اپنے صحن کے اندر اُس کے بدن میں جاگا تھا اب بچے کے دِل سے ہُوا ہو چُکا تھا، جیسے پل کے پل کو لپک مار کر موت کی نیند سوگیا ہو ۔

2009/08/23 14:06

باب دوئم

موضع رکھوال کے دو دوست :۔

چوہدری برکت علی (مرحوم) موضع رکھوال کے ایک معمولی زمیندار تھے ۔ یہ اُن کی حیات کے زمانے کا ذکر ہے ۔ وہ جاٹ برادری کی قوم چوہان سے تعلق رکھتے تھے ۔ چوہانوں کی رکھوال اور گردو نواح کے موضع جات میں اکثریت آباد تھی ۔ چوہدری برکت علی چند ایکڑ آبائی زمین کے مالک تھے ۔ اِس کے علاوہ ایک مُربع زمین اُن کے نیچے تھی جِس کی وہ ٹھیکے پر کاشت کرتے تھے ۔ اُن کا کُنبہ جو اُن کی ماں ، ایک کنواری بہن، ایک بھائی جو ذہنی توازن کے لحاظ سے قدرے کمزور تھا ، اور برکت علی کی دو بیویوں پر مشتمل تھا ۔ پیسہ وافر نہیں تھا ، مگر گیلی سُوکھی اجناس کی اُن کے ہاں قِلّت نہ آتی تھی، جِس کی بدولت کُنبے کے افراد و مویشیان کا پیٹ سال بھر فراغت سے پل جاتا تھا ۔ اُن کے گھر میں اگر کسی شئے کی کمی تھی تو وہ اولاد کی تھی ۔ چوہدری برکت علی کی پہلی شادی اپنے چچا کے گھر ہوئی تھی ۔ اُن کی بیوی عمر میں اُن سے کئی سال بڑی تھی ۔ اس شادی سے اُنہیں اولاد حاصل نہ ہوئی ۔ آدمی نہایت شریف الطبع تھے، کئی برس تک صبرو شکر سے انتظار کرتے رہے ، دُور دُور تک پہنچ کر دُعائیں کروائیں ، تعویز گنڈے کئے ، منتیں مانیں ، چڑھاوے چڑھائے، مگر کامیابی نہ ہوئی ۔ اِس کے باوجود اولاد کی خواہش اُن کے دِل سے نہ گئی ۔ آخر چالیس کے [illegible] میں تھے کہ دوسری شادی کا ارادہ کر لیا ۔ کچھ مشکل اِس وجہ سے پیش آئی [illegible] تو اُن کی عمر بڑی ، اُوپر سے پہلی شادی کی موجودگی ، پھر ایسی بات بھی [illegible] کہ پیسے کی ریل پیل ہوتی ، چنانچہ باوجود تلاش کے اچھا رشتہ دستیاب نہ [illegible] ۔ اسی میں ایک آدھ سال گُزر گیا ۔ آخر میں اپنے سے نیچی قوم کی ایک نوجوان بیوہ سے چوہدری برکت علی نے نکاح کے بول پڑھوا لئے ۔ اور اُسے گھر لے [illegible] ۔ اس

کے بعد از سرِ نو اولاد کا انتظار شروع ۔ آج کل ، آج کل کرتے دِن نکلتے گئے، دنوں کے مہینے اور مہینوں کے سال بن گئے اور اولاد کی صورت نا پید ۔ چوہدری برکت علی اب پچاس کے سن کو پہنچنے والے تھے اور اپنی تقدیر کو خُدا کے ہاتھ میں دے کر دُنیا سے مایُوس ہو چکے تھے کہ ایک واقعہ رُونما ہوا جِس نے اُن کی زندگی بدل کے رکھ دی ۔ اس کی جو کہانی مشہُور ہے وہ کچھ اِسطرح ہے : ایک روز کوئی فقیر گاؤں میں آنکلا ۔ نمبرداروں اور مہاجنوں کے گھر چھوڑ کر وہ چوہدری برکت علی کے دروازے پر پہنچا اور صدا دے کر جواب کا اِنتظار کئے بغیر وہیں بیٹھ گیا ۔ گرمیوں کے دِن تھے ۔ برکت علی کی بیوی نے اُسے دو کٹورے ٹھنڈی لسّی کے پلائے ۔ فقیر خدا جانے کب سے پیاسا چلا آرہا تھا، غٹ غٹ پی گیا ۔ چوہدری برکت علی جنس اجناس کی فروخت کے سلسلے میں لاہور شاللمار کی منڈی گئے ہوئے تھے ۔ جب شام کو لوٹے تو فقیر کو دھرنا مارے دروازے پر بیٹھے پایا ۔ چوہدری برکت علی خُدا خوف اور دِل کے سخی تھے ، فقیر کو پیٹ بھر کھانا کھلایا اور آرام کے لئے چارپائی ڈال کر دی ۔ مگر فقیر نہ اُٹھ کر چارپائی پہ بیٹھا نہ ہی لیٹ کر سویا بلکہ رات بھر وہیں دیوار سے ٹیک لگائے زمین پہ بیٹھا رہا ۔ صُبح سویرے اُس نے صرف لسّی کا ایک کٹورہ پیا اور جانے کے لئے اُٹھ کھڑا ہوا ۔ مگر جانے سے پہلے برکت علی سے مخاطب ہو کر بولا ، 'مانگ کیا مانگتا ہے'۔ برکت علی نے جواب دیا شکر ہے، خدا کا دیا سب کچھ موجُود ہے، بس بخشش کی دُعا کریں ۔ فقیر نے کہا ، "تم زمین پر فرشتے کی صورت نازل نہیں ہوئے کہ ضرورتمند نہ ہو، تم آدمی کی ذات سے ہو اور آدمی کا امتحان خُدا کی رضا میں یہی ہے کہ اس کی ضرورتیں پُوری ہونے میں نہ آئیں ۔ فقیر کی دین کو مت ٹھکراؤ بولو تُمہارے دِل میں کیا ہے ۔" اِس پر چوہدری برکت علی نے دِل کا مُدعا بیان کیا ۔ فقیر نے کہا "جاؤ آج رات کو تمہیں خوشنودی ہوگی" یہ کہہ کر فقیر چل دیا ۔ یہ بھی کہا جاتا تھا کہ جاتے جاتے وہ چوہدری برکت کو قرآن کی دو سطروں کا وظیفہ پڑھنے کو بتاگیا ، البتہ یہ دو سطریں آج تک کسی کے عِلم میں نہ آئی تھیں ۔ خُدا جانے یہ اُس وظیفے کا عِلم تھا یا کہ فقط فقیر بول کی عنایت تھی، چوہدری برکت علی کو اُس رات خواب میں خوشنودی ہوئی اِس کا ذکر یوں کیا جاتا ہے کہ اُنہوں نے دیکھا وہ ایک شجر کے نیچے کھڑے جِس کی ٹہنیاں پھلوں سے لدی ہوئی ہیں ۔ مگر یہ پھل ہیرے جواہرات کی شکل

2009/08/23 14:06

میں ہیں اور اِن سے روشنی کی شعاعیں نِکل نِکل کر چاروں طرف پھیل رہی ہیں ۔ دیکھتے ہی دیکھتے مشرق کی جانب سے سورج نِکل آتا ہے ۔ صبح کی دُھوپ میں پھلوں کی چمک چوند اور بھی زیادہ ہو جاتی ہے جِس سے آنکھیں خیرہ ہونے لگتی ہیں ۔ چوہدری برکت علی گھبرا کر آنکھوں پہ ہاتھ کا سایہ کر لیتے ہیں ۔ خواب ختم ہو جاتا ہے ۔ اِس خواب کی تعبیر یُوں بیاں کی جاتی تھی کہ ان کے ہاں جو بچہ تولّد ہوگا اُس کے نام کی روشنی عالم میں چار دانگ پھیلے گی ۔ چوھدری برکت علی کو ناموری سے غرض نہ تھی ۔ اُنہیں تو فقط اولاد چاہیے تھی ۔ قدرت کے کرشموں کا آخیر کس نے دیکھا ہے ۔ جِس کسی پہ رحمت کی بارش ہو وہی دُنیا میں سردار ۔ چند ہی روز گزرے تھے کہ چوہدری برکت علی کو خبر ہوگئی ۔ اُن کی چھوٹی بیوی کو حمل ٹھہر گیا تھا ۔

رمضان کے مُبارک مہینے کی یکم تاریخ کو اللہ تعالےٰ نے فقیر کی دُعا سے چوہدری برکت علی کو اولادِ نرینہ سے نوازا ۔ اُسی روز افطاری کے وقت پر اُنہوں نے ایک دیگ چاولوں کی پکوا کر گاؤں میں تقسیم کی، باقی کی خوشیاں رمضان المبارک کے احترام میں عید کے موقع تک کے لئے اُٹھا رکھیں ۔ شکرانے کے طور پر بہر حال اُنہوں نے اُسی وقت دو رکعت نفل ادا کر کے خُدا سے وعدہ کیا کہ وہ تیس کے تیس روزے آٹھ پہرے اُٹھائیں گے ۔ مزید یہ کہ آج سے وہ پنج وقتی نماز کے علاوہ باقاعدگی سے تہجّد گزار ہوں گے ۔ شکرانے کا فرض ادا کرنے کے بعد اُنہوں نے دُنیا داری کے کاموں کی جانب توجہ دینے کی کوشش کی ، مگر اُن کا دِل کِسی بات پہ نہ لگا ۔ اُن کے پاؤں زمین پہ ٹِکنے کو نہ آتے تھے ۔ اُنہیں محسوس ہو رہا تھا جیسے آج وہ نئے سِرے سے جوان ہوگئے ہوں ۔ آخر سب کام کاج چھوڑ چھاڑ کر وہ گھر کے اندر زچہ کے پاس جاکر بیٹھ گئے اور بے جھجک ٹکٹکی لگا کر ایک پہر تک اُس ننھی سی جان کو دیکھتے رہے ۔ انتہائی مُنحنی سے چہرے پر اُنہیں نُور کی جھلک نظر آنے لگی تھی ۔ فرزند کا نام اُنہوں نے کرامت علی تجویز کیا ۔

کرامت علی نہایت تیزوطرار اور مضبوط بدن بچہ نکلا ۔ چوہدری برکت علی کو بڑھاپے میں نئی زندگی ملی تھی ۔ اُنہوں نے اپنے بیٹے کی ایک بیش بہا اور نایاب پودے کی مانند پرورش کی ۔ کرامت علی معمولی شکل وصورت کا تھا ، قد بھی لمبا نہ تھا، مگر جِسم خُوب گٹھا ہوا اور گردن بیل کی طرح موٹی تھی ۔ ماں

2009/08/23 14:07

باپ کی جانب سے وافر پیار و محبت کے علاوہ اُسے حیثیت سے بڑھ کر دُنیاوی نعمتیں مُہیا ہوئیں ۔ نتیجے کے طور پر کرامت علی ایک بے خوف اور پُر اعتماد نوجوان نِکلا ۔ کھیل کود کا شوقین ، کبڈی کا اپنے علاقے کا مانا ہوا کھلاڑی ، اِس پہ طرہ یہ کہ دماغ کا بھی ذہین ۔ میٹرک سیکنڈ ڈویژن میں پاس کر لیا ۔ یہ اُس زمانے کی بات ہے جب تعلیم کا ایک معیار قائم تھا اور دُنیا میں اس کی قدر و قیمت تھی ۔ کرامت علی کا جی کالج کی پڑھائی کی جانب راغب ہوا ۔ چوہدری برکت علی مُصِر تھے کہ کرامت علی گاؤں میں رہے اور کاشتکاری میں اُن کے ساتھ شریک ہو ۔ اُن کا کہنا تھا کہ اگر بیٹے کے دو بازو اُن کے ساتھ آ شامل ہوں تو وہ مزید ایک مربع ٹھیکے کی زمین اپنی کھیتی میں رکھ سکتے ہیں ۔ مگر کرامت علی کو اعلےٰ تعلیم کا شوق چرایا ہوا تھا ۔ اُس کے سامنے باپ کی ایک نہ چلی ۔ چنانچہ کرامت علی نے اسلامیہ انٹر کالج میں جو اُن کے گاؤں سے نو میل کے فاصلے پر واقع تھا، داخلہ لے لیا اور روزانہ سائیکل پر آنا جانا شروع کر دیا ۔ تعلیم کے شوق کے علاوہ کالج میں کرامت علی کی سب سے بڑی دِلچسپی کا باعث فیروز شاہ کے ساتھ اُس کی دوستی تھی ۔ اِن دو نوجوانوں کی ہمدمی کی جڑیں بُہت گہری اور پیچدار تھیں ۔

فیروز شاہ ایک پیش امام کا بیٹا تھا ۔ اپنی معمولی حیثیت کے باوجود فیروز شاہ بھی کرامت علی کی مانند قدرتی اوصاف سے مالا مال تھا ۔ سکول کے زمانے سے ہی ان دو بچوں کی آپس میں دوستی تھی اور ساتھ ہی ساتھ رقابت کا انداز بھی تھا ۔ ہر سال کلاس میں اُن کا مقابلہ رہتا ۔ کبھی ایک کے نمبر زیادہ ہو جاتے کبھی دوسرے کے ۔ جب ذرا جوان ہوئے تو مقابلہ پڑھائی کی حدوں سے تجاوز کرگیا ۔ اُن کی دریافت کا سلسلہ وسیع ہوا تو گاؤں کی لڑکیاں اُن کے دائرۂ اشتیاق میں شامل ہوئیں ۔ ساتھ ہی ساتھ اُن کا رن اب کبڈی کے میدان میں پڑنے لگا ۔ دونوں اس کھیل کے جوانمرد تھے ۔ جہاں فیروز شاہ کبڈی لینے کا ماہر ، وہاں کرامت علی پکڑنے کا مشاق ۔ فیروز شاہ کا قدم ایسا کہ سانس توڑے بغیر پُورے قد کے آدمی کو کھڑے کھڑے ٹاپ جاتا اور بدن پہ ہاتھ نہ لگنے دیتا تھا ۔ کرامت علی کا شکنجہ یوں کہ ہوا میں کلائی کو اُچک لیتا اور پھر ہاتھ کٹے تو کٹے ، کلائی پنجے سے نہ چھٹتی ۔ ساتھ ہی کمر پہ قینچی ایسی لگاتا کہ سامنے آ کر زور آور سے زور آور جوان کی سانس اوپر کی اوپر اور نیچے کی نیچے رہ جاتی ۔ یہ

2009/08/27 12:29

مردوں کا رَن اور جوان ہوتے ہوئے لڑکوں کے اِفتخار کا پیمانہ تھا ۔ ان میدانوں میں مقابلہ کرتے دونوں پل کر جوان ہوئے ، میٹرک پاس کیا، اور کالج میں دونوں ایک دوسرے کی شہ پہ اکٹھے داخل ہوئے ۔ دونوں بیشتر اکٹھے دکھائی دیتے، گو ان ساری باتوں میں اگر دیکھا جائے تو فیروز شاہ کا پلّہ قدرے بھاری نظر آتا تھا ۔ میٹرک کے امتحان میں اُس کے نمبر بیس ہی زیادہ تھے مگر وہ فرسٹ ڈویژن میں جا پہنچا تھا ۔ کبڈی کے اندر اس کا انتخاب ڈویژن کی پہلی ٹیم کے سٹار کھلاڑی کی حیثیت سے ہوتا تھا جبکہ کرامت علی ریزرو ٹیم میں ہی رہ جاتا ۔ ظاہری خوبصورتی میں بھی فیروز شاہ کا نمبر اُونچا تھا ۔ وہ لمبے قد کا، سڈول جسم والا خوش شکل نوجوان تھا، جس کی بدولت صنفِ نازک کے درمیان اُس کی کشش نسبتاً زیادہ تھی ۔ لہٰذا عشق عاشقی کے معاملے میں بھی جیت اکثر اُسی کی ہوتی تھی ۔ تاہم ان دونوں کی آپس کی دوستی کبھی نہ ٹوٹی ۔

سن چھیالیس سینتالیس کا زمانہ تھا، تحریکِ آزادی زوروں پر تھی ۔ فیروز شاہ کالج میں پہنچتے ہی طالب علمی سیاست میں کود پڑا ۔ اُس کے اندر لیڈر شپ کی قدرتی صفات موجُود تھیں ۔ گو وہ پہلے سالوں کا طالبعلم تھا، مگر اپنی زور دار شخصیت کی بدولت دوسرے سال کے اوائل میں ہی کالج کی سٹوڈنٹ مسلم لیگ کا سیکرٹری مُنتخب ہوگیا ۔ کرامت علی کا مزاج فطری طور پر سیاست پسند نہیں تھا ۔ مگر فیروزشاہ کی دوستی میں وہ بھی اس میدان میں سرگرم ہوگیا ۔ اسی دوران میں ان دونوں کی نظر رضیہ سُلطانہ پہ پڑگئی ۔

رضیہ سُلطانہ کی کہانی :۔

سُلطان میر انبالے کے رہنے والے تھے اور ایک پُرانے علمی گھرانے سے تعلق رکھتے تھے ۔ آباؤ اجداد مُغلوں کے زمانے میں درباری ہوا کرتے تھے ۔ عربی ، فارسی ، سنسکرت اُن کے گھر کی لونڈی تھی ۔ میر کے گھرانے کی یہ روایت نسل در نسل چلی آرہی تھی ۔ سلطان میر کے زمانے تک پہنچتے پہنچتے حالات کے پیشِ نظر اتالیق گری چھٹ گئی، مگر انگریزی تعلیم کی بدولت چاروں کے چاروں بھائی سرکاری نوکری پہ لگ گئے ۔ سُلطان میر سال افسر کی کلرکی سے ہوتے ہوتے سکریٹریٹ کی ملازمت تک پہنچے اور آخر میں آکر رُکے ۔ کئی برس تک لاہور سکریٹریٹ کی مُلازمت کے بعد سینئر سیکشن افسر کے

2009/08/27 12:29